

## Woh Nazar Jo Badal Gai

[یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر تقریباً برس تھی۔ میں ایک اچھے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد صاحب خاصے تعلیم یافتہ اور دوسرے شہر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، جہاں رہائش کے لئے ان کے پاس ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ ابو وہاں اکیلے رہتے تھے۔ وہ چھٹی کے روز ہم سے ملنے آتے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے میں ہمیں کوئی مسئلہ بظاہر درپیش نہیں تھا لیکن یہاں اماں نوکری کرتی تھیں۔ امی بی اے، بی ایڈ تھیں۔ ایک قر میں بائی اسکول میں کام کرتی تھیں۔ اس لئے وہ اس سہولت کے پیش نظر نوکری چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں، حالانکہ ابو کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی لیکن امی اپنی آزادی کسی قیمت پر دائر پر نہیں لگاسکتی تھیں۔ ایک تعلیم یافتہ گھر ہونے کے باعث ہمارے محلے میں کافی عزت تھی۔ اس لئے امی کی آزادی پر کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ چین میں انسانی ذہن ایک صاف کاغذ کی مانند ہوتا ہے۔ اس پر اگر وقت کا قلم کچھ لکھ دے تو وہ دانستہ ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ بھی میری تمام زندگی پر ایک گہرے سائے کی طرح حاوی ہے۔ اس حادثے کے علاوہ میری زندگی میں اور کوئی ناخوشگوار یاد نہیں ہے لیکن اس کا اثر اتنا شدید ہے کہ میرا طرز زندگی اس نے بدل دیا ہے۔ بابا دین محمد روز ہمارے ہاں دودھ دینے آیا کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بہت بابت تھا لیکن کچھ دنوں سے وہ دیر سے آ رہا تھا۔ ایک دن امی نے پوچھا۔ کیا معاملہ ہے؟ تو کہنے لگا۔ بی بی جی! بڑھاپے نے فرائض سے بھی غافل کر دیا ہے۔ بیماری بھی کسی دشمن کی طرح تاک میں بیٹھی تھی۔ ذرا سا اعضاء کو کمزور پایا حملہ آور ہو گئی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آئندہ دودھ دینے میرا بیٹا آیا کرے گا۔ پھر روزانہ وہ اپنے بیٹے کو دودھ دینے بھیج دیتا تھا۔ اس کا بیٹا فیضان یہی کوئی بتیس چونتیس برس کا ہو گا۔ بابا دین محمد تھا تو غریب لیکن ہر حال میں بیٹے کو تعلیم دلوانا چاہتا تھا، اسی لئے بڑھاپے میں اس وقت تک مشقت کرنا جب تک جسم میں طاقت رہی۔ اس غربت کے عالم میں بھی اس نے اپنے بیٹے کو بی اے تک تعلیم دلوائی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے دودھ تقسیم کرنے کا کام فیضان کے سپرد کر دیا تھا۔ میں اسے فیضان بھائی کہہ کر پکارتی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ گھر کے گیت پر ہی دودھ دے کر چلا جاتا تھا لیکن بعد میں میری والدہ اسے اندر بلا کر بھی دودھ لینے لگیں اور پھر روز کا یہی معمول بن گیا۔ فیضان ایک بظاہر سلجھا ہوا، تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ وہ بے ضرر سا انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ باتیں کرنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے کالج کے زمانے میں بھی بحث مباحثوں میں حصہ لیتا رہا تھا اس لئے جب بھی میری والدہ سے اندر بلا کر دودھ لیتیں، وہ کسی نہ کسی موضوع پر ضرور تبادلہ خیال کرنا تھا۔ ادھر میری والدہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ وہ بھی گفتگو کرنے کی اچھی خاصی ماہر تھیں۔ جب کسی بات پر ان کی بحث چھڑ جاتی تو کافی دیر تک جاری رہتی۔ گفتگو کا یہ سلسلہ ہر روز دراز ہونے لگا۔ والدہ، فیضان کی ذہانت سے بہت متاثر تھیں۔ وہ اس کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ ہر روز فیضان صبح سات بجے ہی ہمارے گھر آ جاتا اور باورچی خانے میں جہاں میری والدہ ناشتہ تیار کر رہی ہوتیں، بیٹھ جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے۔ امی کے اسکول جانے تک وہ وہاں بیٹھا رہتا، پھر گھر چلا جاتا۔ ان دونوں کے درمیان ہر روز ایک نئے موضوع پر بحث ہوتی تھی۔ میں اکثر ان دونوں کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتی تھی لیکن میری ننھی سی عقل ان کی فلسفیانہ گفتگو سمجھنے سے قاصر رہتی تھی۔ میں یہ کہہ کر ہمیشہ ہر خیال کو جھٹک دیتی تھی کہ بڑوں کی باتوں میں میرا کیا عمل دخل۔ بڑوں کی باتیں بڑے ہی جانیں، لہذا میں چپ چاپ ناشتہ کرتی اور اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو جب اسکول سے واپس آتی تھی تو فیضان کی صورت ہی گھر میں سب سے پہلے دیکھنے کو ملتی تھی۔ دوپہر کا کھانا فیضان اپنے گھر کھایا کرتا تھا۔ والدہ نے تو کئی بار کھانا کھانے کی پیشکش کی لیکن ہر بار اس پیشکش کو رد کر دیتا تھا۔ شاید وہ یہاں بس باتوں سے پیٹ بھر نے آتا تھا۔ صبح جب والدہ اسکول جاتیں تو وہ بھی گھر چلا جایا کرتا تھا۔ دوپہر کو امی آرام کرتی تھیں، وہ اس لئے نہیں آتا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ کسی بوتل کے جن کی طرح پھر حاضر ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے گھر کا ایک فرد لگنے لگا۔ اب والدہ گھر سے باہر کے تمام کام بھی اسی سے ہی کروانے لگی تھیں، مثلاً گوشت لانا، بل وغیرہ جمع کروانا یا سبزی لانا۔ سودا سلف لانے کے بعد جو پیسے بچ جاتے، وہ اس سے کبھی واپس نہ لیتی تھیں۔ ان تمام کاموں کے بدلے وہ سارا دن ہمارے گھر میں ہر اجماع رہتا تھا۔ وہ صرف رات کو سونے کے لئے اپنے گھر جاتا تھا۔ جس دن والد صاحب نے آنا ہوتا تھا، اس دن وہ جلد گھر چلا جایا کرتا تھا۔ امی، ابو جان کو اس کے متعلق بتا چکی تھیں۔ ابو نے بھی اس کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ ویسے بھی وہ دھیانوسی خیال رکھنے والے نہیں تھے۔ وہ پڑھے لکھے اور کھلے دماغ کے آدمی تھے۔ ابو اکثر جمعرات کو آتے تھے۔ جمعہ کو وہ سارے گھر کے کام نمٹانے کی کوشش کرتے لیکن چھٹی ہونے کے باعث بعض کام وہ نہ کروا سکتے تھے جیسے بجلی کا بل، کوئی اور دفتری کام۔ تو وہ جاتے ہوئے اکثر یہ کام فیضان کے ذمے لگا جایا کرتے تھے۔ والد صاحب امی پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ اس لئے وہ فیضان پر بھی بھروسہ کرتے تھے۔ میری والدہ نے بھی فیضان کی محلے بھر میں تعریفیں کر دیں کہ بہت نیک لڑکا ہے جو اتنا کام آتا ہے، ورنہ کون اس طرح دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ محلے والے میری والدہ اور والد کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس لئے والدہ جو کہتی تھیں، وہ مان لیا کرتے تھے۔ ہم لوگ تو خیر عزت دار تھے ہی، ہمارے گھر آنے جانے کی وجہ سے فیضان کو بھی محلے میں اچھا سمجھا جانے لگا۔ اس کی نیکیوں کے چرچے بھی زبان زد عام ہو گئے۔ میں عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی کہ سب کچھ دیکھتی تھی، سنتی تھی، کچھ باتیں دماغ پر نقش بھی ہوتی تھیں لیکن میں ابھی انہیں سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ میں سرسری سادہ دیکھتی تھی اور پھر کھیل کود میں مصروف ہو جاتی۔ اماں چونکہ ابو سے مقابلہ کر کے ہم سب کو اپنے قریب رکھے ہوئے تھیں، اس لئے انہوں نے ہماری تربیت میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ پڑھی لکھی ماں ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہمیں ہر قسم کی احساس کمتری سے بچایا ہوا تھا۔ میں بھی ماں کی طرح بولنے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتی تھی۔ اتنی سی عمر میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی تھی اور انعامات حاصل کرتی تھی۔ کھیل کود اور شرارتوں میں، میں بھائیوں سے آگے تھی۔ میں ہر کسی سے اچھے طریقے سے ملتی تھی۔ سب میری ماں کی دی ہوئی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہمیں اس سلیقے سے پالا تھا کہ ہم میں کوئی کمی نہ تھی، لیکن انسان پھر انسان ہے جس کو خطا کا پتلا کہتے ہیں۔ امی سے فیضان کے معاملے میں کوتاہی ہو گئی۔ وقت پونہی گزر رہا تھا۔ اس بات کو اور سات سال بیت گئے۔ وہ پہلے کی مانند آج بھی اسی طرح ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ اب شعور کارس قطرہ قطرہ امرت بن کر میرے دل و دماغ میں اترنے لگا تھا اور میں اس دور کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی جو ماں، باپ کی نیند میں اڑا دیتا

جوانی کی دہلیز پر ہے۔ جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو ماں، باپ کے لئے بوجھ اور پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ میں قدم رکھ چکی تھی لیکن گھر کے ماحول اور دولت کی فراوانی نے میری معصومیت پر کسی قسم کی کوئی ضرب نہیں لگائی تھی۔ میں معصوم اور سادہ دل تھی۔ ویسے بھی لالچالی! امی کو خود بھی اس بات کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے مجھ میں یہ احساس آجا کر کرایا تھا کہ میں اب بچی نہیں رہی۔ اب اکثر ان کے کانوں میں یہ آواز میں پڑنے لگیں کہ تمہاری بیٹی جوان ہو رہی ہے اس لئے تمہارے گھر میں کسی غیر مرد کا انامناسب نہیں ہے لیکن والدہ یہ بات ایک کان سے سنتیں اور دوسرے کان سے نکال دیتیں۔ وہ یہ کہہ دیتیں کہ میری بچی ابھی بہت چھوٹی ہے، ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ میری عقل اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اب کسی کی نگاہیں میں اپنے وجود پر محسوس کر سکتی تھی۔ اب گھر میں فیضان کا آنا ناگوار گزرنے لگا، کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ جب بھی اس کے سامنے جاتی، اس کی نظر میں مجھے اپنے جسم کے آرا پار ہوتی نظر آتیں۔ مجھے اس کا دیکھنا برا لگتا۔ سبھی تو دل چاہتا کہ اس کی آنکھیں نوچ لوں۔ ایسا کیوں ہوتا تھا، اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نہ مجھے اس کی سمجھ تھی، اس لئے نہ تو میں اس بارے فیضان سے کوئی بات کرتی تھی اور نہ ہی گھر والوں کو اس کے متعلق کچھ بتایا تھا۔ بتاتی بھی تو کسے کیوں کہ امی جان مجھے ابھی تک بچی سمجھتی تھیں جبکہ میری سوچ میں اب واضح اور نمایاں بڑا پن نمودار ہو رہا تھا۔ اب جسے میں اچھی طرح محسوس اور سمجھ سکتی تھی۔ اس ہی شعور نے مجھے آہستہ آہستہ یہ بھی سمجھا دیا کہ فیضان کی نظر میں مجھے کیوں بری لگتی ہیں کیونکہ ان میں پاکیزگی نہیں تھی۔ ایک دن والدہ کو خبر ملی کہ ان کی بہت ہی عزیز دوست کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل ان کا جنازہ ہے۔ وہ دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ امی کو جنازے کے لئے یقیناً دوسرے شہر جانا تھا اور انہیں رات بھی وہیں بسر کرنی تھی، اس لئے فوری تار بھجوا کر نانی جان کو بلوایا تا کہ وہ میرے پاس رہیں۔ نانی جان آگئیں تو امی فوراً جنازے میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ہر پل مدد کو تیار فیضان نے انہیں بس میں سوار کروادیا۔ میری نانی بہت ضعیف عورت تھیں۔ ان کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ وہ کسی کی صورت دیکھ کر اسے پہچان نہیں سکتی تھیں۔ صرف آواز ہی سن سکتی تھیں اور آواز کے ذریعے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کرتی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ امی کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ میرے دونوں بھائی باہر کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً رات کو ہی لوٹتے تھے۔ میں اپنے کمرے میں پڑھائی میں مصروف تھی اور نانی جان برابر والے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ نانی کو سنانی بھی بہتر طریقے سے نہیں دیتا تھا۔ اتنے میں فیضان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا کمرے میں آنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ ہمارے گھر کا بڑا گیٹ اکثر کھلا رہتا تھا۔ گھر میں داخل ہونے والا کسی بھی کمرے کا رخ کر سکتا تھا۔ تعجب کالمحہ تو اس وقت آیا جب فیضان نے امی کے متعلق مجھ سے پوچھا۔ میں حیران رہ گئی، کیونکہ امی کو وہ خود ہی گاڑی میں سوار کر کے آیا تھا اور اب انجان بنا معصومیت سے امی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں سمجھی وہ مذاق کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ تعجب ہے انہیں آپ ہی تو صبح گاڑی پر سوار کر کے آئے ہیں۔ کیا انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ کل واپس آئیں گی۔ یہ جواب سنتے ہی وہ کمرے میں چلا آیا اور اس چار پائی پر بیٹھ گیا جس پر میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ دو چار منٹ خاموش رہنے کے بعد اس نے پڑھائی کے متعلق مجھ سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ میں نے بڑا سمجھتے ہوئے ٹھیک ٹھیک جواب دیئے۔ میں اسے تعلیم کی راہ میں پیش آنے والے مسائل اور مشکل سوالات کے متعلق بتانے لگی۔ وہ کتاب دیکھنے کی غرض سے میرے نزدیک آ گیا۔ معصوم سی سوچ رکھنے والی لڑکی یہ نہ جان سکی کہ اس کے دل میں کیا فتنور چھپا ہوا ہے۔ اس بات کا اندازہ بھی مجھے نہیں تھا کہ مرد کی نیت بدلنے میں صرف چند منٹ ہی لگتے ہیں۔ وہ چند لمحوں میں ہی بڑی محنت سے بنائی ہوئی ساری دیواروں کو عبور کر جاتا ہے۔ میں نے اس کے عزائم سمجھنے میں بہت دیر لگادی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے ایک دم اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے تک جا پہنچا۔ میں یہ سمجھی کہ وہ جانے والا ہے۔ میں اسی طرح اس کی باتوں کے جواب دیتی رہی، مجھے دھچکا اس وقت لگا جب اس نے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر درندگی دیکھی تو روح کانپ گئی۔ اپنا انجام بہت برا نظر آنے لگا۔ میری حالت پنجرے میں قید بلبل کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے بھاگ کر اس قفس سے آزاد ہونا چاہا، جہاں میری عزت کو درگور کیا جانے والا تھا۔ میری عزت کے ساتھ ساتھ میں بھی زند و دفن ہو جاتی۔ نانی کو اس کے آنے جانے کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈتی میرے دروازے تک فرشتہ بن کر آ گئیں وہ ڈر گیا اور بھاگ گیا نانی اندر آئیں، میں بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ وہ سمجھیں کہ میں امی کی بہت لاٹلی ہوں اس لئے ان کی غیر موجودگی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ وہ مجھے گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں لیکن اصل بات کو وہ نہ سمجھ سکیں۔ اپنی رسوائی کا چرچا کرنے کی مجھ میں بھی ہمت نہ تھی۔ پہلے تو سوچا کہ نانی کو سب کچھ بتا دوں لیکن پھر میں نے یہ خیال بدل دیا۔ میں امی کو یہ سب کچھ بتانا چاہتی تھی تا کہ انہیں اس بات کا احساس ہو کہ وہ آج تک آستین میں سانپ پالتی رہی ہیں۔ وہ تمام رات میں نے رو کر گراں دی۔ انکھوں کے سوتے تھے خشک ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اگلے روز جب میری والدہ تشریف لائیں تو میں فوراً ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ روتے ہوئے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ میری ماں میرے لئے ایک مضبوط پناہ گاہ ثابت ہو گی۔ وہ مجھے اپنی محبت اور شفقت کے مضبوط حصار میں لے کر اس بھیڑ سے ضرور انتقام لے گی۔ سمجھتی تھی کہ وہ مجھ پر بری نظر ڈالنے والے کی آنکھیں نکال دیں گی اور ایسے شخص کو کبھی بھی اپنے گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھنے دیں گی جس نے ان کی بیٹی کو پرہیز کیا لیکن میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میری ماں نے الٹا مجھ ہی کو سمجھانا شروع کر دیا کہ میں فیضان کے سامنے نہ آیا کروں، تھوڑی ہی دیر میں فیضان آ گیا۔ اسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ دونوں پہلے کی طرح پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت میرے تمام اعتماد کے رشتے کرچیوں کی صورت بکھر گئے۔ ان کرچیوں کی جہن ہمیشہ کے لئے دل میں اتر گئی۔ میں مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ حال یہ تھا کہ جب بھی فیضان کو دیکھتی، مجھے اپنی ماں سے نفرت ہونے لگی۔ سوچتی کیا دنیا میں کوئی ماں ایسی بھی دیکھی ہے جو محض چند کام کروانے کی خاطر اپنی اکلوتی بیٹی کو غیر محفوظ کر دے لیکن اس بات کی جتنی جاگتی مثال میری ماں کی شکل میں میرے سامنے تھی۔ میرے اندر ایک لاپرواہی کی تیش میں، میں خود ہی جل رہی تھی۔ نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے میں بہت کمزور ہو گئی۔ ذرا ذرا سی بات میرے اعصاب اور مزاج میں کشیدگی اور تनाव پیدا کرتی۔ ماں اور گھر سے کوئی دلچسپی نہ رہی، جینے کا سہارا اب صرف میرا باپ تھا۔ دن رات سلگتی رہی۔ آخر میں نے میٹرک کر لیا۔ بہت اچھی طالبہ تھی لیکن میرا سب کچھ فیضان کی نذر ہو گیا۔ اس نے مجھے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ اپنے

کرنے کے بعد بھی اندر کی سرگوشیوں سے بھی خوف کھانے لگی، جس نے میری پڑھائی کو بھی متاثر کیا۔ میٹرک اچھے کالج میں داخلے کا مسئلہ آیا تو امی کہنے لگیں کہ میں اپنے والد کے پاس چلی جانوں جبکہ والد صاحب کا خیال تھا کہ ہم سب کو ہی ان کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہونا چاہیے۔ امی کے ہزار روکنے اور نہ چاہنے کے باوجود ابو نے تبادلہ دوسرے شہر میں کروالیا۔ جس دن ہم لوگ جارہے تھے، میں بہت خوش تھی کیونکہ ایک منحوس صورت ہمیشہ کے لئے میری نظروں سے دور ہو رہی تھی۔ میں اپنے والد کے تحفظ کے مضبوط قلعے میں جارہی تھی۔ ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا لیکن ہزار کوشش کے باوجود اس تلخ یاد کو اسی گھر میں دفن نہ کر سکی جو میری روح کا ناسور بن گئی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ شاید جب تک میری ماں میرے سامنے ہے، اس واقعے کو نہیں بھول سکتی، جس نے مجھے وقت کے تپتے ہوئے ریگزار میں ننگے پاؤں جلنے کے لئے چھوڑ دیا اور میں آج تک اہلہ پاسی دشت میں بھٹک رہی ہوں']